

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اظہار الحق اور اس کے مؤلف حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی

میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ چند سطریں ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کے بارے میں لکھوں جس کو اللہ نے قلعہ اسلام کا محافظ بنایا تھا، جس کی ذات سے حق و صداقت کو فتح و نصرت حاصل ہوئی جس کی عالمانہ بصیرت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا، اور جس نے اسلام کی وکالت و حمایت کا فرض ان نادر حالات میں انجام دیا جس وقت اس طرح کا کام اپنی موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا اور بغیر جان کی بازی لگائے کوئی اس میدان میں ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔

میرا اشارہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی طرف ہے (سن پیدائش ۱۲۳۳ھ، وفات ۱۳۰۵ھ، تدفین جنتہ المحلاة، مکہ مکرمہ) جنہوں نے اپنے عیسائی حریف کو مناظرہ میں شکست فاش دی اور ایسے دلائل سے کام لیا جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں منتقل ہوتا تھا، تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ان کی شہرت بام عروج پر تھی، وہ اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جس کا اعتراف ان کے تمام معاصر علماء کو تھا اور آج تک عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا اور باخبر آدمی ان کے کارنامے سے واقف اور ان کی علمی عظمت اور مجاہدانہ کارنامہ کا قائل ہے۔

مولانا کیرانویؒ کا وہ عظیم کارنامہ جس نے ان کو علمائے سلف اور مجاہدین امت کے درمیان ممتاز مقام عطا کیا، یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی مدافعت اس طرح کی کہ حق و باطل کو آئینہ کی طرح روشن کیے دکھا دیا، اسلام کی خلاف غلط بیانیوں، تہمتوں اور شکوک و ادھام کا طوفان دشمنوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان تہمتوں کی حقیقت واضح کر دی بلکہ مسلمانوں کے اندر دین پر یقین و اعتماد کو پختہ سے پختہ تر کر دیا، مسلمانوں کو اپنے دین کی صداقت اور اپنے رسول کی لائی ہدایت پر از سر نو غیر متزلزل ایمان نصیب ہوا۔

حضرت کیرانویؒ نے یہ خدمت ایسے زمانہ میں انجام دی جو مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور صبر آزما زمانہ تھا، ان کا حریف وہ تھا جس کو اس زمانہ کے سب سے بڑے فاتح گردہ گئی پشت پناہی حاصل تھی، اور وہ بڑی دنیاوی طاقت اس کی سرپرست تھی جس کے قلمرو میں آفتاب نہیں نہروب ہوتا تھا، اور جس

کے تمدن، تہذیب، تعلیم کی پوری دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسری طرف مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، اپنے حریف کے برعکس، ایسی قوم کے فرد تھے جو شکست خوردہ بھی تھی اور شکستہ حل بھی، اور آزمائش کے سنگین ترین وقت سے گزر رہی تھی، اس کو اپنے تابناک ماضی کا بھی ہوش نہیں تھا، اس کے نزدیک اسلاف کے مجاہدانہ کارنامے قصہ پارینہ تھے جو اس کی سیاسی پسپائی اور اقتصادی بد حالی کا مداوا نہیں بن سکتے تھے، اور اس ذہنی پسپائی کے نتیجہ میں خود دین اسلام کی صداقت و حقانیت پر یقین میں کمزوری بلکہ کھوکھلا پن آچکا تھا، انگریز اس کو اپنا حریف اور حقیقی دشمن سمجھتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی ان کے دین و تہذیب کو کوئی علمی محاذ پر چیلنج کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا سازاورد مسلمانوں کی حوصلہ مندوں کو مٹانے اور ان کی معنوی قوت کمزور کرنے پر صرف ہو رہا تھا، یورپ کی عیسائی مشنریاں پوری آزادی کے ساتھ حکومت وقت کی سرپرستی اور کفالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اپنے جال بچھاٹے ہوئے تھیں، ہزاروں کی تعداد میں عیسائی مبلغین ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، سیکڑوں ناخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ افراد، اقبال مند فاتح قوم، کا مذہب اختیار کر رہے تھے، اور ان کی ظاہری شان و شوکت، حکومت و قوت، کمزور ناخواندہ اشخاص کے نزدیک حقانیت کی دلیل تھی۔

عوام اور سادہ لوح لوگ تو الگ رہے، خود علمائے کرام کو عیسائیت کی پوری حقیقت نہیں معلوم تھی، ان کو بائبل کے عہد قدیم، عہد جدید، ان کی شرحوں اور تفسیروں سے واقفیت نہیں تھی، ان کتابوں کی تاریخ اور ان میں جو مختلف زمانوں میں اضافے ہوتے رہے، اور کتر ہیونت کی جاتی رہی، بائبل سوسائٹیوں نے جو تصرفات کیے، عیسائی انجیل مقدس انجمن نے جس طرح بائبل کو ایڈٹ کیا، ان سب سے سطحی واقفیت بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کو نہیں تھی، علمائے کرام کی ذہنی جولانیوں اور علمی تحقیقات کے میدان یا تو فقہی جزئیات تھے یا یونانی منطق و فلسفہ اور علم کلام کی بحثیں، یا کسی درجہ میں احادیث و تفسیر پر حواشی و تحقیقات، عیسائیوں کے ان ناروا حملوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری انہوں نے نہیں کی تھی۔ یہ حملے ان کے لیے ایسے تھے جیسے کسی نے اچانک رات کی تاریکی میں ان کے گھر پر شکنجہ مارا ہو، ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی، ہمت و جرات کے ساتھ کتب و سوابق پر گہری نظر کی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہو اور عیسائیت کو عیسائیت کے بنیادی اور علمی مراجع سے سمجھا گیا ہو، جو ان پر تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے تجزیے جس انداز میں کیے گئے ہیں ان سے واقفیت بھی لازمی تھی۔ ان سب کے لیے ایک طرف تو بھرپور غیرت ایمانی کی ضرورت تھی، دوسری

طرف وسیع مطالعہ اور بصیرت مطلوب تھی، اور خاص مشکل یہ تھی کہ عیسائیت پر تحقیقی کام کرنے والے کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک سُرنگ تھی جو اندر سے تاریک تھی اور اس میں پیچ در پیچ راستے تھے، کھانچے اور کھائیاں تھیں، یعنی اس کے علمی مآخذ نہ ہونے کے قریب تھے اور جو تھوڑے بہت تھے وہ یورپین زبانوں میں تھے، ان زبانوں میں تھے، ان زبانوں میں زیادہ مانوس زبان انگریزی تھی، اہل ہند نے ابھی اس زبان کو سیکھنا شروع ہی کیا تھا اکثر مسلمان اور خاص طور پر علماء اس سے متنفر تھے، کیونکہ یہ ان ظالموں کی زبان تھی جنہوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور ان کی تذلیل کی تھی، دوسری طرف خود عیسائی مشنریاں بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی کتاب مقدس پر جو جرح ہوئی ہے اور اس کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ ہندوستان لائیں، کیونکہ ان کی مصلحت تبلیغ کا تقاضہ یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بے خبر رکھا جائے، لہذا وہ یہاں کے لائبریریوں اور علمی مراکز کو ایسی کتابیں کیوں کر فراہم کر سکتے تھے بلکہ انکی کوشش تھی کہ اس طرح کتابیں اس ملک میں آنے نہ پائیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے لیے یہ صورت حال پریشان کن ضرور تھی مگر ان کی حمیت و غیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اور ان کے وہ رفقاء جو اسلام کی مداخلت اور اسلام پر عائد کردہ تہمتوں کی حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، اپنے مورچہ پر جم کر مقابلہ کریں، عیسائی مبلتوں نے جو اپنے آپ کو بمبشتر (جنت کا مژدہ سناتے والے) کہلانا پسند کرتے ہیں، مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ اور تجربہ کار و سیاسی بازی گروں اور امور جنگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پوزیشن حملہ آور کی ہوتی ہے۔ اپنے حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دینا بڑی مہارت کا کام ہے، یہی سیاست عیسائی مبلتوں نے اپنی طاقت کے زور پر اختیار کی تھی۔ مگر مولانا کیرانویؒ نے اپنی دینی بصیرت سے محسوس فرمایا کہ عیسائیوں سے دوید و مقابلہ ضروری ہے ورنہ نہ صرف ہندوستانی لے مسلمان ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو جائیں گے بلکہ عرب ممالک کو بھی انہی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا ہندوستان میں عیسائیوں سے مقابلہ صرف یہاں کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہاں کے مسلمان جو سیاسی لحاظ سے پسپا ہیں اور اپنی سلطنت کھو کر شکستہ دل ہیں، اگر اس مورچہ پر بھی شکست کھا گئے اور اس زبانی مناظرہ میں اپنے حریف کا کھوکھلا پن ثابت نہ کر سکے تو عیسائیت کا سیلاب پورے عرب اور مشرقی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ اور اگر یہ زخم خوردہ اور شکستہ دل مسلمان اس مناظرہ سے سر بلند و سرخ رو ہو کر نکلتے

لے مشترکہ غیر منقسم ہند۔

ہیں تو یہ سیلاب بلانہ صرف ہندوستان سے بلکہ تمام مشرقی مسلم ممالک سے رگ جاتے گا۔
 مولانا کیرانویؒ نے اللہ کا نام لے کر اس مہم کو سر کرنے کا عزم کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ عیسائیت کو عیسائیت کے اصلی مراجع و ماتخذ سے سمجھیں گے، ان کا تجزیہ کر کے تحقیق کریں گے، ان کے اس عزم کو اور پختہ اس بات نے کر دیا کہ اس زمانہ میں ایک مشہور عیسائی پادری، عیسائیت کا مبلغ اعظم فنڈر (PFANDER) ہندوستان آیا اور علمائے دین کو ملکارا اور علانیہ مناظرہ کی دعوت دینے لگا اور ملک کے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں دورے کرتے لگا، بڑے بڑے جلسے کرتا اور اس میں تقریر کرتا، اپنے مذہب کی پیروی کی دعوت دیتا تھا، حضرت کیرانویؒ کو ایک اور مشکل کا سامنا تھا، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے اور دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ایک خاص عمر ہوتی ہے اس سے وہ تجاوز کر چکے تھے، زندگی بھر ان کا مشغلہ علوم دینیہ پڑھنا پڑھانا رہا، قرآن وحدیث سے سابقہ رہا، یا علوم عقلیہ سے۔ دوسری طرف فنڈر صرف اپنی ہی زبان (انگریزی) جانتا تھا، تھوڑی بہت عربی فارسی زبان سمجھ لیتا تھا، اب ضرورت تھی کہ کوئی ایسا شخص ہوتا جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دوسری یورپین زبانوں کے مراجع سے واقف ہوتا اور عیسائی وثائق کو پڑھ کر ترجمہ کر سکتا۔

اللہ کی مصلحت و حکمت نے حضرت مولانا کیرانویؒ کے لیے ایک ایسے شخص کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا جس کی ضرورت تھی۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ یعنی اللہ کے کارندے سپاہی زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانویؒ کی مدد کیلئے غیب سے کھڑا کیا وہ ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی تھے، جو ۱۸۳۲ء میں لندن جا کر ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کر چکے تھے اور انگریزی کے علاوہ یونانی زبان بھی پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے عیسائیت کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مراجع خرید لیے تھے اور یہ کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے، حضرت کیرانویؒ کے لیے یہ قوت بازو اور بہترین معاون ثابت ہوئے، اور وقت کا تقاضا جس جہاد کے لیے تھا اس میں مولانا کے شریک و مددگار بن گئے۔

حضرت کیرانویؒ نے اس طرح پوری تیار کر لی اور معرکہ حق و باطل کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ دوسری طرف فنڈر کی جولانیاں بھی شباب پر تھیں، ایک شتر بے مہار کی طرح پوری بے حیائی اور حرأت کے ساتھ اسلام پر ناروا حملے کر رہا تھا۔ حضرت کیرانویؒ نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے اس شخص کا دہانہ توڑنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے عیسائی مبغضوں کو بھی سبق سکھا دیئے جانے کی ضرورت ہے، اس طرح مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری کا ازالہ ہوگا اور ان کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین حاصل ہوگا۔

حضرت کیرانویؒ نے محسوس فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فنڈر سے مناظرہ کیا جائے، اور اعلانیہ جلسے میں یہ مناظرہ ہو جس میں مسلمان اور اہل وطن، یورپین حکام، عیسائی اور عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی سب موجود ہوں، فنڈر کو اپنی کتاب ”میزان الحق“ پر بڑا ناز تھا اور اکثر اسی سے وہ استدلال کرتا تھا اور اس کو وہم تھا کہ مسلمان اور ان کے علماء ان دلائل کا رد نہیں کر سکتے۔ مولانا کیرانویؒ نے اس پادری (فنڈر) سے مناظرہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے خط و کتابت کی اور دعوت دی کہ وہ سب کے سامنے آئے، جس میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہوں۔ جب پادری فنڈر پر بہت زور پڑا، اور اس نے دیکھ لیا کہ اب بغیر مناظرہ کیے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس دعوت کو چار و ناچار قبول ہی کر لیا، اگر اس کو اس مناظرہ کے نتائج کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی سامنے آنا قبول نہ کرتا، بہر حال ۱۱ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء اکبر آبادی (راگرہ) میں یہ مناظرہ طے پایا۔ یہ مقام عیسائیت کے فروغ کا مرکز تھا اور اس کے ایک محلہ کا نام محلہ ”عبدالہمسبح“ ہی پڑ گیا تھا کیونکہ وہاں عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی کافی تعداد میں تھے۔

ستیتہ تاریخ میں جلسہ شروع ہوا۔ ضلع کے حکام، عدالت کے جج اور انگریزی چھاؤنی کے بہت سے عہدہ دار موجود تھے، پادری فنڈر اور پادری ولیم کلین (WILLIAM CLEAN) اور شہر کے اعیان و سربراہ آئندہ اشخاص، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خاں حضرت کیرانویؒ کے مترجم و معاون کی حیثیت سے شریک تھے، مناظرہ کے پانچ موضوع تھے۔

۱۔ بائبل عہد قدیم (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) میں تحریف ہوئی۔

۲۔ بائبل میں کچھ احکام منسوخ قرار دیئے گئے۔

۳۔ عقیدہ تثلیث۔

۴۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

۵۔ قرآن کی صداقت و صحت۔

اس مناظرہ میں شرط یہ تھی کہ اگر مولانا کیرانویؒ نے اس مناظرہ میں بازی جیت لی تو فنڈر اسلام قبول کر لے گا اور اگر اس کے برعکس ہوا تو مولانا کیرانویؒ عیسائیت کو تسلیم کر لیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے اس مناظرہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پہلے روز کا مناظرہ ختم ہوا تو ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا، ہر مجلس میں یہی موضوع تھا جس پر تبصرے ہو رہے تھے کیونکہ مناظرہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادری فنڈر نے یہ اعتراف کر لیا کہ آٹھ مقامات میں بائبل کے اندر تحریف موجود ہے۔

دوسرے روز جلسہ عام میں عیسائی، سکھ، ہندو اور مسلمانوں کی بڑی تعداد مناظرہ میں شریک ہونے کے لیے آئی۔ فنڈر نے کہا کہ انجیل میں جو غلطیاں ہیں وہ کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن وہ مہربان بنیں عیسائی

تشلیٹ، حضرت عیسیٰ کی الوہیت، فداء اور شفاعت کا ذکر ہے وہ تحریف سے محفوظ ہیں۔ پادری فنڈر کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا جس کو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا۔ حضرت کیرانویؒ نے جواب دیا۔
”رجب تم انجیل میں تحریف کو تسلیم کرتے ہو۔ تو پوری کتاب مشکوک ہو گئی۔“

اس پر بحث ختم ہوئی اور پادری فنڈر تیسرے روز مناظرہ کے لیے آیا ہی نہیں۔ اس کے بھاگ کھڑے ہونے سے واضح ہو گیا کہ وہ مناظرہ کے میدان میں شکست کھا گیا اور مسلمانوں کی یہ بڑی کامیابی تھی جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہوا، اور پادریوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت عام مسلمانوں نے اپنے اندر محسوس کی۔ عیسائیت کے عقلی و علمی دبہ اور بلند بانگ دعوؤں اور اسلام پیغمبروں کی حقیقت سب کی سمجھ میں آ گئی۔
اس مناظرہ کے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا واقعہ پیش آیا جو ایک طرح سے مسلمانوں کی آخری کوشش تھی کہ انگریزوں کے بچائے ہوئے جال سے نکل آئیں، لیکن اس جنگ میں مسلمان ناکام رہے، اور ان کی ناکامی کے بعد انگریز غضبناک، طاقت ور اور انتقام کے جذبے سے پھرے ہوئے دشمن کی طرح پیش آئے اور وہ جانتے تھے کہ اس جنگ کی قیادت مسلمان کر رہے تھے اور انہی کا یہ پلان تھا اور وہی اس کی ہمت کر سکتے تھے، اور دوسرے ہم وطن ان کے ساتھ ہو لیے تھے، اس لیے مسلمانوں کے علماء ان کے جذبہ انتقام اور غصہ کا سب سے زیادہ شکار تھے اور آئندہ بھی انگریز کو خطرہ انہی مسلمانوں اور ان کے علماء سے تھا، عوام میں انہی کی مقبولیت تھی لہذا انگریزوں نے ایک ایک عالم کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کیا، ان کو پھانسی دیتے، سولی پر چڑھاتے، ان کی گردیں درختوں سے لٹکاتے اور طرح طرح کی تذلیل و اہانت کا سلوک کرتے اور تلاش کر کے ایسے افراد کو ڈھونڈتے جن کی مسلمانوں کے درمیان عزت و توقیر ہوتی، اور لوگ جن کی بات سنتے۔
انگریزوں کو جن افراد کی تلاش تھی ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ صف اول کے لوگوں میں تھے، کیوں کہ مذہبی مناظرہ میں وہ ان کو شکست دے چکے تھے اور ان کے خلاف جو جہاد کیا گیا اس میں شریک تھے۔ مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ مولانا کچھ عرصہ کے لیے ایک گاؤں میں روپوش ہو جائیں، جب انگریز ان کی تلاش میں اس گاؤں میں بھی پہنچ گئے تو مولانا نے کلبھاڑی لے کر کسانوں کے بھیس میں کھیٹ میں گٹائی کا کام شروع کر دیا، اور اس طرح اللہ نے ان کو بچالیا اور انہوں نے کسی طرح سورت کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر بلاد مقدسہ کی طرف ہجرت کر لی، یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے یعنی جنگ آزادی کے پانچ سال بعد، ان کی جائیدادیں سب کی سب ضبط کر لی گئیں جو خاصی بڑی تھیں اور ان کو نیلام کر دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کے خلیفہ سلطان عبدالعزیز عثمانی تھے اور مکہ مکرمہ میں ان کے گورنر شریف عبداللہ بن عون تھے، جب ان کی علمی منزلت کا پتہ چلا تو حرم شریف میں ان کو درس دینے کی اجازت مل گئی اور اس وقت کے سربراہ اور وہ

علماء سے ان کے تعلقات ہوئے جن میں مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے عالم شیخ احمد زینی وعلانؒ تھے جو مولانا کیرانویؒ کے خاص احباب میں تھے اور انہوں نے ہی مولانا کیرانویؒ کو شریف مکہ سے ملایا اور علمائے مکہ سے ان کا تعارف کرایا۔

ایک اتفاقی بات پیش آئی کہ پادری فنڈر ایک عرصہ تک یورپ کے مختلف ملکوں جرمنی، سوئزر لینڈ، انگلینڈ میں رہا اس کے بعد اس کو لندن کی تبلیغی انجمن (مشیئری) نے قسطنطنیہ بھیجا کہ مسلمانوں کے مرکزی مقام خلافت کے پایہ تخت میں جا کر عیسائی تبلیغ کی مہم چلائے۔ اس نے سلطان عبدالعزیز سے ملاقات کی اور ہندوستان کے اس مناظرہ کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ عیسائیت کو اسلام پر فتح حاصل ہو گئی، سلطان عبدالعزیز خلیفۃ المسلمین تھے ان کو اس بیان سے سخت حیرت ہوئی، انہوں نے شریف مکہ کو لکھا کہ ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے معلوم کریں کہ اصل واقعہ کیا ہے اور کس طرح پیش آیا؟ اور اس مناظرہ اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت (۱۸۵۷ء) کی صحیح نوعیت سے مطلع کریں۔ شریف مکہ شیخ العلماء سید احمد وعلان سے پورا واقعہ معلوم ہو چکا تھا، انہوں نے دار الخلافہ کو مطلع کیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور یہ کہ اس مناظرہ کے ”بطل“ رہبر ہوا جو عالم دین ہیں وہ حسن اتفاق سے مکہ مکرمہ میں موجود ہیں، سلطان عبدالعزیز نے حضرت مولانا کیرانویؒ کو دار الخلافہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ مولانا وہاں (۱۲۸۵ھ) مطابق ۱۸۶۴ء میں) تشریف لے گئے۔ جب پادری فنڈر کو معلوم ہوا کہ شیخ مولانا کیرانویؒ قسطنطنیہ آ رہے ہیں اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔ سلطان عبدالعزیز نے وہاں کے علماء کو جمع کیا، جس میں وزراء اور اخیان ملک شریک تھے، مولانا کیرانویؒ سے اس مناظرہ کا حال سنا کہ کس طرح اسلام کو انہوں نے عیسائیت پر فتح یاب کیا، پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی داستان سنی، سلطان نے اسی وقت عیسائی مبلغوں پر پابندی لگا دی اور اس سلسلہ میں سخت قوانین نافذ کیے۔ سلطان اکثر و بیشتر نماز عشاء کے بعد مولانا کیرانویؒ سے ملا کرتا اور آپ کے نصائح وارشادات سنا کرتا۔ اس مجلس میں حکومت کے صدر اعظم خیر الدین پاشا، تونیسی بھی شریک رہتے، وہاں کے شیخ الاسلام اور بڑے سربراہان و علماء بھی اس مجلس میں آیا کرتے تھے۔

مولانا سے جب صدر اعظم اور خلیفہ عبدالعزیز نے مناظرہ کا قصہ سنا اور ان کی علمی عظمت، وسعت مطالعہ اور سمجھت پر ان کی ناقدرانہ بصیرت کا اندازہ کیا تو یہ درخواست کی کہ وہ عربی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ دیں جس میں ان پانچوں عناوین پر سیر حاصل بحث ہو جو مناظرہ کے لیے موضوع بحث قرار پائے تھے۔ مولانا نے اس تجویز کو قبول فرمایا اور ”اظہار الحق“ کی تالیف وہیں قسطنطنیہ میں شروع کر دی۔ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ میں یہ تالیف شروع کی اور ذی الحجہ میں مکمل کر لی، یعنی صرف پچھ ماہ میں یہ ضخیم دستاویز تیار ہو گئی۔ سلطان کی خدمت میں یہ

ہدیہ پیش کیا اور مقدمہ میں تحریر فرمایا کہ یہ کتاب شیخ العلماء علامہ زینی دحلانؒ کی تجویز پر لکھی ہے۔ صدر اعظم خیر الدین پاشا نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نے تو یہ کام امیر المومنین کی فرمائش پر کیا ہے، مناسب یہ تھا کہ امیر المومنین کا نام آپ لکھتے، خلیفۃ المسلمین کا اکرام اور حق و انصاف سے قریب تر بات یہی ہے۔ مولانا نے فرمایا یہ حد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے میں نے انجام دی ہے اس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ العلماء دحلان نے مجھ سے پہلے اس کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ اس مناظرہ کی روداد قلم بند کروں اور مکہ مکرمہ میں میں نے اس کتاب کے مواد جمع کرنا شروع کر دیئے تھے اور شیخ دحلان ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مجھے شریف مکہ سے متعارف کرایا اور آج دربار خلافت تک میری رسائی کا سبب وہی ہیں، لہذا ان کے فضل و کرم کا اعتراف ضروری ہے۔

اس طرح یہ کتاب معرض وجود میں آئی، اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے دفاعی موقف کے بجائے حملہ آور ہونے کا موقف کیا ہے، اور یہ موقف بہت ہی کارآمد ہوتا ہے کہ حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا جائے، اور اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ ملزم کے کھڑے میں کھڑا ہو، اور وہ اپنی صفائی پیش کرے، پہلے علماء نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا اور تورات و انجیل اور قرآن کو ہم پتہ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے، اس طرح ان قدیم صحیفوں کو وہ اہمیت حاصل ہو جاتی جس کے حقیقتاً وہ مستحق نہ تھے، حالانکہ خود حاملین تورات و انجیل یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کی طرح بغیر کسی تغیر و تبدل کے آسمانی صحیفوں کا امتیاز ان میں پایا جاتا ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مناسب قدم اٹھایا تھا کہ اپنی کتاب ”الاجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح“ میں جابر حانہ موقف اختیار کیا تھا، کیوں کہ اہل تحقیق علماء کے نزدیک تورات و انجیل کی حیثیت دوسرے تیسرے درجہ کی احادیث و سیرت کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے، اور نہ ان صحیفوں کی ثابت شدہ سند ہے۔ ان صحیفوں کو حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مختلف مرحلوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں کچھ حضرت مسیح کے اقوال ہیں اور کچھ ان کے چیرات کا بیان ہے اور کچھ ان کے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ مولانا رحمت اللہ کی انوی نے بہت گہرائی کے ساتھ ان صحیفوں کا مطالعہ کیا تھا اور اس کی تہ کو پہنچ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز گفتگو سے مناظرہ کی نوعیت بدل گئی اور حریفوں کو جو پہلے بالادستی ہو جایا کرتی تھی وہ ختم ہو گئی۔

۲۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا کی انوی نے زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کی ہے، کیوں کہ اس میں بحث و مناظرہ اور چوں چرا کی گنجائش رہتی ہے۔ مولانا نے صاف نظر آنے

والی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی باتیں ذکر کی ہیں جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے بائبل میں ایک دوسرے سے متضاد باتوں کو نکال دکھایا ہے کہ کوئی الہامی کتاب جس میں تحریف نہیں ہوئی ہو، اس طرح متضاد باتوں کا مجموعہ نہیں ہو سکتی، اس طرح کی ایک سو آٹھ کھلی ہوئی غلطیوں کو انہوں نے دکھایا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جیسے ریاضی کے فارمولے ہوتے ہیں، دو اور دو چار کی طرح جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، دوسرے کھلی ہوئی تحریف کے نمونے ہیں جہاں الفاظ کے اضافے ہیں، کہیں کمی ہے، کہیں تشریحی جملے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایک آسانی صحیفہ کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی۔

۳۔ عیسائیوں نے انجیل کو وحی منزل ثابت کرنے کے لیے جو عبارت آرائی کی ہے اور مغالطے میں ڈالنے کی کوششیں کی ہیں ان کو نقل کرنے کے بعد انتہائی آسان اور قابل قبول اسلوب بیان میں ان کا رد کیا ہے۔
۴۔ حضرت کیرانویؒ نے عقیدہ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اور اس کا علمی تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ کوئی بھی صاحب عقل و ذوق اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

۵۔ حضرت کیرانویؒ نے صرف یہ نہیں کیا کہ عیسائیت کے عقائد اور ان کے صحیفوں کی حقیقت کھول کر دکھادی بلکہ قرآن کریم پر جو ان کے اعتراضات رہے ہیں اس کا بھی تشفی بخش جواب دیا اور دکھایا کہ قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عیسائیوں کے پیدا کردہ شبہات کا جواب دیا اور اسی سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ، معجزات کو بیان کیا اور آپ کے حق میں انبیائے سابقین نے جو بشارتیں دی ہیں ان میں سے اٹھارہ (۱۸) بشارتوں کا ذکر کیا۔
ان اسباب کی بنا پر کتاب کی اہمیت بڑھ گئی اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی، ایک ترکی عالم نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام ”ابرار الحق“ رکھا۔ ایک صاحب قلم نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو ہندو پاکستان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

مولوی غلام محمد راندھیری نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا تھا، اردو میں مولانا اکبر علی سہارن پوری مرحوم نے تین جلدوں میں اس کا ترجمہ کیا تھا، جس کا نام ”دربائبل سے قرآن تک“ ہے اس پر مولانا تقی عثمانی نے مفصل مقدمہ لکھا ہے وہ فاضلانہ اور محققانہ ہے اور اس لائق ہے کہ علیحدہ سے شائع ہو۔ عیسائیوں کے پادریوں کا یہ معمول رہا کہ جہاں یہ کتاب بازار میں آئی اس کے تمام نسخے خرید کر جلادیتے تاکہ لوگ پڑھ نہ سکیں، اس لیے بار بار اس کی طباعت ہوتی رہی، مراکش کی وزارت اوقاف و امور مذہبی نے اس کو بہت آب و تاب سے شائع کیا ہے۔

شیخ عبدالرحمن بک باجہ جی زادہ نے اپنی کتاب ”الفارق بین الخالق والمخلوق“ میں
(بقیہ ص ۳۶ پر)